بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا جو خاص اجلاس لاہور میں آٹھ جولائی سے بارہ جولائی تک منعقد ہوا، اس میں جماعت کے کام کا جائزہ لیا گیا اور مستقبل کے پروگرام کے متعلق بعض تجاویز پیش کی گئیں۔ یہ جائزہ اور تجاویز جماعت کے ہر بہی خواہ کی توجہ کی پوری طرح محتاج ہیں، اس لیے آج ہم ان کے بارے میں چند معروضات پیش کریں گے۔

مجلس کے اس اجلاس میں جماعت کی رفتارِ ترقی کی جو مختلف رپورٹیں پیش کی گئیں ان کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لا اٹھنے کے بعد ارکان اور متفقین کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے اور خاص طور پر مشرقی پاکستان میں جماعت کا اثر و نفوذ بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے:

ارکان کی تعداد	۱۵۳۸	مشرقی پاکستان	۱۶۷	مغربی پاکستان	۱۳۷۱
مقامی جماعتوں کی تعداد	۲۰۹	"	۲۹	"	۱۸۰
متفقین کی تعداد	۴۲۲۷۴	"	۱۳۴۲۸	"	۲۸۸۴۶
حلقہ ہائے متفقین کی تعداد	۱۴۶۳	"	۵۳۲	"	۹۳۱
دارالمطالعوں اور جماعتی لٹریچر کی لائبریریوں کی تعداد	۵۵۵	"	۲۵۰	"	۳۰۵

مشرقی پاکستان کے طوفان زدگان کی امداد نقد: ۱۳۲۰۰۰ ـ ۰ روپے

پارچات : ۷۳ گانٹھیں

نیا کپڑا : ۱۶۲۳ گز

ارکان کی تعداد گزشتہ ایک سال میں تین سو سے کچھ اوپر ہی بڑھی ہے اور اسی طرح متفقین کی تعداد میں بھی ہزاروں کا اضافہ ہُوا ہے۔ جماعت کی یہ ترقی اس کے ارکان یا ہی خواہوں کی کاوشوں کی رہینِ منت نہیں بلکہ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے بالکل غیب سے اس کے بڑھنے کے سامان پیدا کر دیتے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا - اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ قُلُوْبًا اَوَّاهَةً مُّخْبِتَةً مُّنِيْبَةً فِيْ سَبِيْلِكَ - اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِيْ تَقُوْلُ وَخَيْرًا مِّمَّا نَقُوْلُ -

---

شوریٰ کی اس کارروائی میں چوہدری غلام محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی حلقہ کراچی کی وہ رپورٹ بھی سامنے آئی ہے جو انہوں نے افریقہ میں اسلام کی رفتارِ ترقی کے بارے میں اپنے ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر پیش کی ہے۔ چوہدری صاحب حالات کا جائزہ لینے کے لیے خود افریقہ کے اہم مقامات پر تشریف لے گئے اور صورتِ حال کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افریقہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار اُس سے بہت مختلف ہے جو مغربی ممالک اور مصر کے اخبارات بیان کر رہے ہیں تو وہاں مسلمانوں کی طرف سے اب تک کوئی قابلِ ذکر منظم کام نہیں ہوا ہے اور نہ ہی ایسے ادارے ہی موجود ہیں جنہیں منظم کر کے اس کام میں لگایا جا سکے۔ البتہ فہمیدہ اور دُور اندیش مسلمانوں میں اس کی ضرورت کا احساس اُبھر رہا ہے۔"

اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دسمبر ۱۹۶۳ء میں بالکل اپنی ذاتی حیثیت میں مشرقی افریقہ کا دورہ کریں تاکہ کوئی جماعتی تعصبات تبلیغِ دین کی راہ میں حائل نہ ہونے پائیں۔

پھر اس دورہ کے اختتام پر وہیں اُن حضرات کی ایک کنونشن بلائی جائے جو سینوں میں اسلام کا درد رکھتے ہیں اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ اللہ کا یہ دین دوسرے ادیان پر غالب ہو۔ انہی دردمند اصحاب کے اشتراک و تعاون سے وہاں ایک مضبوط تبلیغی ادارے کی بنا ڈالی جائے جو ایک نظم کے تحت اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

اس ادارے کو مضبوط بنانے اور اُسے ہر قسم کی امداد بہم پہنچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کے سارے مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے اور انہیں اس کام کی اہمیت کا اچھی طرح احساس دلایا جائے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جماعت نے یہ طے کیا ہے کہ مولانا کی مراجعت پر پاکستان میں تمام دینی جماعتوں کے اشتراک سے ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں ایک خالص دینی اور غیر جماعتی تبلیغی ادارے کی تشکیل کی جائے جو اس فرض کو ہر قسم کے تعصبات اور انتیازات سے بالاتر ہو کر بطریق احسن سرانجام دے۔

جماعت اسلامی تائیدِ ایزدی سے اصلاحِ معاشرہ کے کام پر اپنے حالات اور وسائل کے مطابق شروع سے ہی اپنی توجہ صرف کر رہی ہے لیکن اس مرتبہ امیر محترم نے کام کا جو نیا نقشہ پیش فرمایا ہے وہ انشاءاللہ نتائج کے اعتبار سے زیادہ حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔ مولانا کی تجویز یہ ہے کہ ملک کے اندر کچھ ایسے نمونے کے علاقے تیار کیے جائیں جو موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک اسلامی معاشرے کے آئینہ دار ہوں تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسلامی معاشرے کی برکات کیا ہیں۔ اس غرض کے لیے چوبیس پچیس، تیس تیس دیہات پر مشتمل کچھ ایسے علاقے منتخب کیے جائیں جہاں پہلے ہی جماعت کے اثرات کافی پھیل چکے ہیں ان میں سے ہر ہر گاؤں میں مضبوط حلقہ ہائے متفقین منظم کیے جائیں اور ان حلقوں میں باہمی ربط پیدا کر کے ایک ٹھوس بلاک بنا دیا جائے۔ پھر اس بلاک کے اندر منظم طریقہ سے تدریج مساجد کی اصلاحِ حال، جرائم اور فواحش کے انسداد، دارالمطالعوں، سکولوں اور دینی تعلیم کے

مدرسوں کے قیام، راستوں کی درستی، صحت و صفائی اور طبی امداد کے انتظام، بستی کے یتیموں بیواؤں معذور اور غریب طالب علموں کی امداد، زکوٰۃ اور عشر کی تنظیم۔ باہمی تنازعات کے بستی میں ہی فیصلے اور امداد باہمی کے اداروں کے قیام کا انتظام کیا جاتے"۔

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے ہوئے کس قسم کی مشکلات راستے میں حائل ہونگی، ان کے بارے میں کوئی چیز بھی یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ یہ بڑی ہی کٹھن اور مشکل منزل ہے برسوں کے بگڑے ہوتے معاشرے کے اندر نیکی اور بھلائی کی بالا دستی کو بالفعل قائم کرنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس راہ میں قدم قدم پر مزاحمتیں ہونگی۔ شریر لوگ باہم منظم ہوکر اس کی راہ روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مفادات کے پرستار اپنے مفادات کو خطرات میں پڑتے ہوتے دیکھ کر اس کے خلاف ہر قسم کی غلط فہمیاں پھیلائیں گے۔ جن لوگوں کی برسہا برس سے چودھراہٹیں قائم ہیں، انہیں اس سے سخت کرب و اضطراب محسوس ہوگا اور وہ اس بات کے لیے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کریں گے کہ کسی طرح یہ تحریک کامیاب نہ ہونے پاتے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر اللہ نے کرم فرمایا اور اس کام کے لیے کچھ مخلص، دردمند اصحاب بصیرت آگے بڑھے اور انہوں نے دلسوزی و یکسوئی اور فہم و تدبر کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھایا تو یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوگا۔

برائی اگر منظم ہوکر معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرکے اس کے سارے جسم کو زہر آلود کرسکتی ہے تو آخر نیکی اس کے اندر نفوذ کرکے اُسے صحت و توانائی کیوں نہیں بخش سکتی؟ بُرائی اگر جسم و جان کا سب سے خطرناک روگ ہے، تو نیکی اس کے مقابلے میں سراپا شفا ہے سرتاپا رحمت ہے، سکونِ قلب کے حصول کا واحد سرچشمہ ہے، اس کے ذریعہ باہمی رقابتیں ختم ہوتی ہیں۔ لوگوں کے درمیان محبت اور مودّت کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں، اور ان کے اندر ایثار، ہمدردی، جرأت اور عزتِ نفس جیسی بلند صفات پرورش پاتی ہیں۔

آپ اگر خیر و شر کی باہمی آویزش کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا کے ہر معاشرے میں خدا خوفی، پرہیزگاری، تقویٰ اور پاکبازی کو ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جو لوگ انفرادی طور پر ان صفات کے حامل ہوتے ہیں، اُن کی سوسائٹی کے ہر طبقے میں بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کا یہی مقدس گروہ جب نیکی، شرافت اور خدا ترسی کو کسی معاشرے کے اندر عملاً قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو پھر دنیا میں اس سے زیادہ مغضوب اور قابلِ نفرت طبقہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس باطل فلسفہ کے مطابق نیکی اُسی وقت تک قابلِ قدر ہے جب تک یہ انفرادیت کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جسارت نہیں کرتی، یہ یقیناً ایک سعادت اور برکت ہے لیکن اسی حد تک جہاں تک یہ دل کی گہرائیوں کو منور کرتی رہے، لیکن جونہی اس کے اندر باطل کی تاریکیوں کے خلاف صف آرا ہونے کا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو تو پھر یہ ہوسناکی بن جاتی ہے اور اس وجہ سے اس کے راستے میں مزاحم ہونا ضروری ہے۔ اس غلط نظریہ کے حامیین شاید نیکی کو صرف ایک ایسی لطیف قلبی کیفیت خیال کرتے ہیں جو آب وگل کی دنیا میں منتقل ہونے کی اوّل تو سرے سے صلاحیت ہی نہیں رکھتی یا اگر کسی طرح کوشش کر کے اُس میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے تو وہ اپنی لطافت کھو بیٹھتی ہے۔ ان کی نظر میں نیکی ایک ناقابلِ اظہار وجدانی کیفیت ہے جس کا تمام تر تعلق داخلی زندگی سے ہے اور اس بنا پر خارجی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ وہ "دل من داند و من دانم و داند دل من" کی مصداق ہے۔

نیکی کا یہ غلط تصور کسی ایک مقام یا عہد کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ مفاد پرست طبقوں نے اس باطل خیال کو ہر دور اور ہر معاشرے میں بڑی تدبیر اور طاقت کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس زہر کے اثرات ہم پورے معاشرے میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں نیکی اور پارسائی کا نقشہ کچھ اس طرح اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ کوئی شخص کارجہاں سے بالکل الگ تھلگ گیان دھیان میں مصروف رہے۔ اُسے دنیا اور اس کے دھندوں سے کوئی

سروکار نہ ہو۔ وہ اگرچہ بھلائی کا علمبردار ہونے کا دعوی کرتا رہے اور بوقت ضرورت خیر کے کلمات بھی اس کی زبان فیض ترجمان سے نکلتے رہیں لیکن وہ برائی کے خلاف نبرد آزما ہونے سے ہمیشہ پرہیز کرے کیونکہ خیر و شر کی کشمکش میں اگر وہ براہ راست شریک ہو جاتے تو اس کے دامنِ تقدیس پر دنیاداری کے کچھ چھینٹے پڑنے کا پورا پورا احتمال ہے۔

پاکبازی کا یہ غلط نقشہ ہمارے ذہنوں میں اس قدر تحکم کے ساتھ بیٹھ گیا ہے کہ ہم جب بھی کسی نیک اور خدا ترس انسان کو برائی کے خلاف عملاً جدوجہد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اونچے اور خداوند تعالیٰ جیسی بلند و بالا ذات سے لگاؤ اور محبت کرنے والے شخص کو "امورِ دنیا" میں دخیل ہونا زیب نہیں دیتا۔

مجھے بارہا کئی ایسے نیک نفس انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کی خدا خوفی، پرہیزگاری، تقویٰ اور للٰہیت کی کبھی سوسائٹی میں بڑی دھوم تھی لیکن جب انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو پھر لوگوں نے ان پر بلا تکلف دنیا پرستی اور مفاد پرستی کے الزامات عائد کیے حالانکہ ان کی زندگی کا کوئی فعل اُن کے ان بے بنیاد الزامات کی تصدیق نہیں کرتا۔ میں اُن کی شریفانہ زندگیوں پر جب کبھی غور کرتا ہوں تو انہیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ خداترس، نبی آخر الزماں کا زیادہ فدائی اور متبع، حلال و حرام کے معاملے میں زیادہ محتاط اور ایثار اور قربانی میں زیادہ پُرجوش پاتا ہوں لیکن ایک طبقہ ہے کہ انہیں دنیا پرستی کے طعنے دیتے جاتا ہے۔ ان طعنہ دینے والوں سے کئی مرتبہ تبادلۂ خیالات بھی ہوا اور میں نے ان سے دنیا پرستی کے الزام کی حقیقت بھی معلوم کرنا چاہی لیکن اس معاملے میں انہیں جتنا زیادہ ٹٹولا یہی تلخ حقیقت اُبھر کر سامنے آئی کہ ان کے ذہن یہ باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی خدا پرست امورِ دنیا میں براہِ راست دخیل ہو کر اُن کی اصلاح کی کوشش کرے۔ انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے جو فقرات اپنی زبان سے بالکل غیر شعوری طور پر ادا کیے وہ ان کے

اس غلط نقطۂ نظر کی پوری طرح ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے فرمایا: "کسی اللہ والے کو انتخابات کے جھگڑوں سے کیا کام، یہ تو ہڈی ہے جس کی طرف سگِ دنیا ہی لپکتا ہے"۔ دوسرا شخص جس نے عدالت میں ایک صاحبِ اقتدار ظالم کے خلاف ڈٹ کر شہادت دی تھی، اُس کے بارے میں یہ کہا جانے لگا کہ عدالتوں کے چکر کاٹ کاٹ کر اُس کی روحانیت مُردہ ہو جائے گی۔ تیسرا شخص جس کی طرف ہمارے گاؤں کا ہر غریب اور مظلوم دادرسی کے لیے رجوع کرتا تھا، اُس کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلائی جانے لگی کہ یہ شخص اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ایک چوتھا شخص جس نے بنیادی جمہوریتوں کے صدر کی حیثیت سے نہایت ہی قابلِ ستائش خدمات سر انجام دی ہیں اور کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر ہر جھگڑے کا فیصلہ عدل و انصاف کی معتدل میزان پر تول کر کیا ہے، اُس کے متعلق یہ الفاظ سننے میں آتے ہیں: "یہ اچھے بھلے اللہ اللہ کر رہے تھے اب انہیں بھی حکومت کی چاٹ لگ گئی ہے۔ ان کا سارا وقت جھگڑے چکانے میں ضائع ہو رہا ہے"۔ خدا کے ان نیک بندوں پر اگرچہ الزامات کی نوعیتیں مختلف ہیں لیکن ان کے بارے میں فیصلہ ایک ہی ہے کہ اس "دنیا کے کاموں" میں الجھ جانے کی وجہ سے ان کا خدا سے تعلق کم ہو گیا ہے اور وہ روحانیت کے بلند مقام سے نیچے اُتر کر دنیاداروں کی پست سطح پر آگئے ہیں۔ اس رائے کا اظہار اس کثرت سے کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات اس سے خود بھی کبھی کبھی متاثر ہو کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ "آخر یہ دنیا کے مصائب ہی ہیں جن میں ہم بلا وجہ اپنی توانیں اور صلاحیتیں کھپا رہے ہیں"۔

امورِ دنیا اور امورِ دین کی اس تفریق کی جڑیں بڑی گہری ہیں اور انہیں دنیا پرستوں کی چالاکی اور عیاری نے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ لوگوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح پیوست کیا ہے۔ شیطان اور اُس کے گماشتے اپنے کاروبار کو کبھی بھی چمکا نہیں سکتے جب تک انہیں اس امر کا پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ نیکی اور بھلائی کے علمبردار اُن کے راستے میں

(باقی صـ۵ پر)

(بقیہ اشارات)

مزاحم نہ ہوں گے چنانچہ شیطان کے انہی ہتھکنڈوں کا نتیجہ ہے کہ بُرائی ہر جگہ کھلے بندوں دندناتی پھر رہی ہے اور شرافت ہر مقام پر دبک کر رہ گئی ہے، شر منظم ہو کر ایک سیلِ بے پناہ کی طرح ہر طرف امنڈتا جا رہا ہے اور نیکی خس و خاشاک کی طرح اُس کے آگے بہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے اس کے اندر آج بدقسمتی سے کوئی طاقت اور توانائی باقی نہیں رہی اور وہ کسی مرحلہ پر بھی شر سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہیں کر سکتی۔

نیکی کی یہ بے بسی دیکھ کر انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے حاملین اب دنیا سے بالکل مٹ چکے ہیں اور انسانیت نے پورے شعور کے ساتھ شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیکی دنیا سے ناپید نہیں ہوئی۔ آج بھی انسانوں کی عظیم اکثریت اگر اس کی علمبردار نہیں تو دل و جان سے اس کی قدرداں ضرور ہے۔ وہ اس بات کی آرزومند ہے کہ دنیا میں خیر اور بھلائی کو فروغ حاصل ہو اور فسق و فجور یہاں سے مٹے۔ پھر نیک لوگوں کی تعداد بھی کوئی اتنی کم نہیں کہ ان کا سرے سے کوئی وزن ہی نہ ہو۔ آج بھی معاشرے کے اندر ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جن کی پرہیزگاری، خدا خوفی، نیک نفسی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ حضرات کافی تعداد میں موجود ہونے کے باوجود بالکل بے اثر ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک ایک ہی ہے کہ نیکی منظم نہیں اور شر اس کے مقابلہ میں منظّم و متحد ہے۔

وہ لوگ جو انسانی نفسیات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانوں کی عظیم اکثریت بالکل انفعالی مزاج رکھتی ہے۔ اگر خیر اور بھلائی منظم ہو کر ایک قوت بن جاتے تو عام لوگ اسی کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور اس کے برعکس اگر برائی اپنی قوتوں کو سمیٹ کر ایک تحریک کی صورت میں ڈھل جاتے تو پھر وہ معاشرے پر اپنے اثرات مترتب کرنا شروع کر دیتی ہے۔

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اُس نے اسلامی معاشرے میں خیر اور بھلائی کی قوتوں کو امکانی حد تک ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے عقائد اہلِ سنت کے عقائد سے کسی لحاظ سے بھی مختلف نہیں۔ یہ کسی نئی امت یا کسی نئے فرقے کی تشکیل کی دعوت نہیں دیتی۔ یہ کسی ایسے زعم میں بھی اپنے آپ کو گرفتار نہیں پاتی جس کے تحت یہ کہا جا سکے کہ نیکی اور پرہیزگاری بس اس کے اندر ہی سمٹ کر رہ گئی ہے اور اس کے باہر جو کچھ بھی ہے وہ فسق و فجور ہی ہے۔ بعض مفاد پرست لوگ ہمیں بارہا اسلام اور صالحیت کے ٹھیکیدار ہونے کا طعنہ دیتے ہیں لیکن وہ علیم و خبیر ذات جس سے دل کی کوئی کیفیت بھی پوشیدہ نہیں وہی اس الزام کی حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم کبھی اس زعمِ باطل میں گرفتار ہوں ہم نے اپنی طرف سے اس امر کی صراحت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ جو مسلمان جماعت میں شامل نہیں وہ بھی اُسی طرح کے مومن و مسلم ہیں جس طرح کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ، اور ہمیں تسلیم ہے کہ جماعت سے باہر کے بہت سے حضرات تقویٰ، پرہیزگاری، للّہیت کے اعتبار سے اُس اونچے مقام پر فائز ہیں جس پر جماعت کے رفقاء کو بھی رشک آتا ہے۔ ہماری جو کچھ کوشش بھی ہے اس کا ہدف مقصود صرف ایک ہی ہے کہ کسی طرح نیکی اور پاکبازی کے ان اعلیٰ مگر منتشر نمونوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا جائے تاکہ خیر اور بھلائی ایک قوت بن کر برائی کا مقابلہ کر سکے۔

نیکی کی تخم ریزی بلاشبہ انسانی قلب کے اندر ہی ہوتی ہے لیکن خیر کا یہ بیج اپنی صحیح نشوونما کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ اسے ایک صحت مند ماحول میسر آئے۔ اسی صحت مند ماحول کے پیدا کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی اول روز سے کوشاں ہے۔ ہم قرآن و سنت اور آویزشِ خیر و شر کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے اسی ایک نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دین کی اصل

بنیاد خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق ہے لیکن اس تعلق کو تقویت پہنچانے اور اس کی صحیح نہج پر پرورش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم ان موانع کو دور کرنے کی کوشش کریں جو اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کوئی پرائیویٹ رشتہ نہیں بلکہ یہ تعلق ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کا انسان کے ساتھ تعلق اور پھر اس کا پوری کائنات اور دنیاوی اسباب و وسائل کے ساتھ تعلق بھی صحیح خطوط پر استوار ہو۔

انہی تعلقات کو ہم اسلامی نظام کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم جو اس نظام کے قیام کی انسانیت کو دعوت دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی اب ہمارے نزدیک ایک ثانوی حیثیت کی چیز بن کر رہ گئی ہے اور ہماری جدوجہد کا اصل مقصد صرف ایک نظام کا برپا کرنا ہے۔ یہ ایک جھوٹ ہے جسے ہمارے خلاف گھڑا گیا ہے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ دین میں اصل اہمیت تعلق باللہ کی ہی ہے لیکن یہ تعلق خارجی زندگی میں بھی منعکس ہوتا ہے اور پھر یہ تعلق انسان کے سارے تعلقات میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ تعلق اس بات کا طالب ہے کہ انسان اگر اپنے رب کے حضور میں ایک خاص نظام کے تحت سجدہ ریز ہو، اس کی راہ میں جانی اور مالی ایثار کرے تو اس تعلق کی اساس پر اپنی سیاست، معیشت اور معاشرت کو بھی از سر نو ترتیب دے تاکہ اس کی داخلی زندگی اور خارجی زندگی کے درمیان کوئی تضاد باقی نہ رہے اور اس کی جو قوتیں اور صلاحیتیں اس کشمکش میں صرف ہو رہی ہیں وہ باطل کو سرنگوں کرنے میں کھپائی جاسکیں۔

قرآن مجید میں ذکر و شکر، خشیت و تضرع، خشوع و خضوع کے جو الفاظ اللہ کے ساتھ قلبی لگاؤ اور روحانی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں یہ بلاشبہ بندۂ مومن کی داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان داخلی کیفیات کو اپنے صحیح مرتبہ اور مقام پر برقرار رکھنے کے لیے خارجی زندگی کی موافقت بھی انتہائی ضروری ہے

ایک شخص اپنے رب کا بڑا ہی مطیع اور فرمانبردار ہے، اور اس کے خوف سے لرزنے والا ہے۔ اس کے خالق اور مالک نے روزہ اور نماز کی صورت میں جو فرائض اس پر عائد کیے ہیں انہیں بڑے شوق کے ساتھ بجا لاتا ہے مگر اس کے رزق میں حرام عناصر کی آمیزش بھی ہے جس سے وہ کسی صورت بھی بچ نہیں سکتا۔ کیا یہ عناصر اُس کے دل کے صاف اور شفاف آئینے کو مکدر نہیں کریں گے اور پھر اس تکدر کا اثر تعلق باللہ پر نہیں پڑے گا؟

ہمارے اس دور میں فسق و فجور کا جو خوفناک طوفان ہر طرف سے اُٹھ رہا ہے اس کی تباہ کاریوں سے کون ناواقف ہے۔ اس نے اُن پاکباز اور مقدس لوگوں کے گھروں کو بھی برباد کر دیا ہے جن میں آج سے چند سال پہلے ذکرِ الٰہی کے بڑے چرچے ہُوا کرتے تھے، قرآن اور سنت کی تعلیم دینے والوں کے صُلب سے آج دشمنانِ دین پیدا ہو رہے ہیں، اور اصلاح و ارشاد کے فرض کو انجام دینے والے آج اپنی اولاد کے منہ سے الحاد اور زندقہ کا پرچار سنتے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ ماحول نے انہیں اپنی آہنی گرفت میں اس قدر شدت سے لے لیا ہے کہ وہ بیچارے تمنا اور آرزو رکھنے کے باوجود کچھ کر نہیں پاتے کیا اس افسوسناک صورتِ حال سے تعلق باللہ پر کوئی زد نہیں پڑتی؟

عابد و معبود کا رشتہ کوئی بے حس اور بے جان رشتہ نہیں جس پر زمانے کے حالات کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ یہ رشتہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا حساس اور غیرت مند ہے جب کوئی شخص ایک مرتبہ اپنے آپ کو اس میں منسلک کر لیتا ہے تو پھر اُسے اپنے باقی رشتوں کو بھی اسی کے تابع کرنا پڑتا ہے۔ یہ رشتہ اس بات کو کبھی گوارا ہی نہیں کرتا کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق تو اسلام کے بتائے ہوئے ضابطے کے مطابق قائم کیا جائے مگر انسان اور انسان کے درمیان تعلقات اور انسان اور کائنات کے درمیان تعلقات کفر اور الحاد کی بنیادوں پر استوار ہوں۔ یہ رشتہ بڑا ہمہ گیر ہے اور ہمہ گیر تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس مقدس رشتہ کی ہمہ گیری پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے۔ اگر تعلق باللہ صرف ایک داخلی کیفیت کا نام ہوتا تو مسلمانوں کے اندر تجدید و احیائے دین کی ہر دور میں جو کوششیں ہوئی ہیں اُن سب کا قریب قریب ایک ہی رُخ ہوتا لیکن ہم انہیں اصول اور مزاج کے اعتبار سے ایک جانتے ہوئے بھی اُن کے دائرۂ کار کو ایک دوسرے سے مختلف پاتے ہیں۔ ایک گروہ اٹھتا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں کی انگیٹھیوں کو گرمانے کی کوشش کرتا ہے، دوسرا اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے لیے ہمت آزما نظر آتا ہے، تیسرا جبّاروں اور قہاروں کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتا ہے، چوتھا عوام کے افکار و نظریات کی تطہیر میں اپنی قوتیں کھپاتا ہے، پانچواں قرآن و سنت کے سرمدی چشموں سے فیضیاب ہو کر معاشرتی زندگی کے لیے تفصیلات مرتب کرتا ہے، چھٹا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے جاہلیت کو مٹانے، اسے احکامِ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ ان مختلف کوششوں میں سے آپ کسی ایک کوشش کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی تہ میں بجز اللہ کی رضا کے کوئی دوسرا محرک کام کر رہا ہے۔ یہ ساری کوششیں تعلق باللہ کے تقاضوں کے تحت ہی کی جاتی رہی ہیں۔ اللہ کا دین ایک پورا نظامِ فکر و عمل ہے جس کی رفیع الشان عمارت اپنے خالق اور مالک کے ساتھ صحیح اور مضبوط تعلق کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس تعلق کو جس طرف سے بھی صدمہ پہنچنے کا احتمال ہوا مسلمانوں کے حسّاس اور فرض شناس طبقے اسی طرف فوراً متوجہ ہوئے۔ اگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ امّتِ مسلمہ کی معاشرتی زندگی تو اسلامی آئین و ضوابط کے مطابق چل رہی ہے لیکن اس میں روح باقی نہیں رہی تو انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر اس میں روح پھونکنے کی کوشش کی۔ پھر انہوں نے جب یہ دیکھا کہ جاہلیت کی یلغار ان کی معاشرتی زندگی کے لیے خطرہ بن رہی ہے تو انہوں نے پوری قوت سے اس کا راستہ روکنے کی جدوجہد کی۔ اسی طرح انہوں نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ اُن کا سیاسی اور معاشی نظام اس بنیاد پر قائم نہیں رہا جو انہیں قرآن و سنت نے فراہم کی ہے تو انہوں نے اجتماعی زندگی کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا عزم کیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا

سکتا ہے کہ انہوں نے ہر عہد میں اس بات کا اہتمام کیا کہ یہ اسلامی نظام کسی طرح اپنی اصل شکل میں برقرار رہے اور اس کی ہمہ گیری میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ انہوں نے جس جہت سے بھی کوئی کمی دیکھی اُسے فوراً پُورا کرنے کی کوشش کی۔ اسلام کا ہمہ گیر تصوّر ہی سامنے رکھ کر ہم اپنی تاریخ کی صحیح تعبیر کرسکتے ہیں اگر یہ تصوّر آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے تو پھر ہمارے بہت سے ائمہ اور صلحاء کی کوششوں کو جنہوں نے نظامِ حکومت کو بدلنے کی سعی کی بجز مفاد پرستی کے کسی چیز پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکر و نظر کے ان فتنوں سے بچائے جن کے تحت ہم خدا پرستوں کی مخلصانہ اور سرفروشانہ کوششوں کو دنیا پرستی سے تعبیر کرنے کی جسارت کریں۔

(بقیہ مطبوعات)

موجودہ خامیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کا علاج تجویز فرمایا ہے۔ کتاب میں ضمناً گوناگوں مباحث آگئے ہیں۔ آخر میں انہوں نے برِصغیر کی دینی جماعتوں پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

یتیم پوتے کا مسئلہ | مصنّف: میاں محمد نوشہروی۔ ناشر ادارہ عروجِ اسلام راوی پارک لاہور۔ قیمت ۶ آنہ۔

میاں محمد نوشہروی ایک دردمند عالم ہیں، اور اپنے علم و فہم کی حد تک تصنیف و تالیف کے ذریعہ دین کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر پمفلٹ میں انہوں نے یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں منکرینِ حدیث کے شبہات و دلائل کا جواب دیا ہے۔